ہمارا مسئلہ تعلیم

(۲)

از سعید احمد

تیسرا سوال یہ ہے کہ تعلیم گاہوں میں ڈسپلن کیونکر قائم کیا جائے۔ یہ سوال پہلے دو سوالوں سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ کیونکہ اگر یونیورسٹیوں میں تعلیم کا اور علم کا معیار پست بھی رہا تو اس کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ طلباء کی علمی استعداد بلند نہیں ہوگی اور یونیورسٹی ایجوکیشن سے جن علمی فوائد کی توقع ہو سکتی ہے یا ہونی چاہیئے وہ حاصل نہیں ہونگے۔ لیکن اگر طلباء ڈسپلن کے عادی نہ ہوئے، ان کی زندگی آئین و ضابطہ کی پابندی کی خوگر نہ ہوئی تو اس کا اثر اُن کی آئندہ زندگی پر پڑے گا اور وہ خواہ کسی شعبہ میں کام کریں اور کسی ہی پیشہ کو اختیار کریں بہرحال وہ ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لائق نہ ہونگے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر بڑی سنجیدگی اور توجہ سے غور کیا جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ عام طور پر ڈسپلن اور اخلاقی اصلاح دونوں کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ اخلاق بنتے ہیں بنائے نہیں جاتے اور اس کے برعکس ڈسپلن رہتا نہیں بلکہ رکھا جاتا ہے۔ آج کل عام شکایت ہے کہ طلبا کی اخلاقی حالت اچھی نہیں بلکہ روز بروز انحطاط پذیر ہے اور ان میں ڈسپلن نہیں ہے۔ ابھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں یعنی ہم کو دراصل کہنا یوں چاہیئے کہ طلباء کی اخلاقی حالت اچھی نہیں ہے اور یونیورسٹیوں میں (نہ کہ طلباء میں) ڈسپلن نہیں ہے۔ اب آئیے پہلے ان دونوں میں سے ہر ایک کے اسباب پر غور کریں، پھر اُن اسباب کا تدارک کیونکر ہو سکتا ہے اس پر غور ہو سکتا ہے۔

طلباء کی اخلاقی حالت

یونیورسٹی اور کالج میں جو طلباء آتے ہیں ہائی اسکولوں سے آتے ہیں اس بنا پر طلباء سے یہ توقع کرنا کہ کالج یا یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اخلاقی اعتبار سے وہ بدل جائیں گے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اخلاقی عادات و اطوار اور طبیعت کے رجحانات و عواطف کے نشوونما اور ان میں پختگی کا دور ہائی اسکول میں ہی گزر جاتا ہے۔ اس دور میں اگر کوئی طالب علم اچھا ہے تو وہ آئندہ کالج کی زندگی میں بھی اچھا رہیگا

اور اگر یہاں اخلاقی بے راہ روی اس میں پیدا ہو چکی ہے تو کالج میں داخل ہو جانے کے بعد عام حالات میں وہ بے راہ روی ترقی پذیر ہی ہوگی، کم نہیں ہوگی۔ اب دیکھئے کہ آج کل ہمارے ہائی اسکولوں کا کیا حال ہے؟ ظاہر ہے کہ ہائی اسکولوں میں عام طور پر ہوسٹل نہیں ہوتے۔ ان میں جو لڑکے تعلیم پاتے ہیں وہ مقامی ہی ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ہوسٹل میں رہنے سے اخلاقی تعمیر و اصلاح کے جو فوائد ان کو حاصل ہو سکتے تھے یہ طلبا ان سے محروم رہتے ہیں۔ ان طلبا کے لئے ان کا اپنا گھر اور اُن کے اسکول کا ماحول صرف یہی دو جگہیں ہوتی ہیں جہاں ان کے اخلاق کی تعمیر ہو سکے۔ لیکن دونوں جگہ عموماً حالات ایسے ہوتے ہیں کہ طالب علم کو کہیں بھی اخلاقی تعمیر کی مدد نہیں ملتی۔ جہاں تک گھر کا تعلق ہے تو چند مہذب تعلیم یافتہ اور شائستہ گھرانوں کو چھوڑ کر۔ آج کل غربت و افلاس۔ جہالت اور بعض اور وجوہ کی بنا پر ہماری سوسائٹی کی جو حالت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ زندگی کے اعمال و افعال پر مادی اغراض اور جسمانی خواہشات و مطالبات کا اس درجہ غلبہ ہے کہ انسان کی روحانی حس اور اس کا اخلاقی وجدان جن پر اخلاقِ فاضلہ کی تعمیر ہوتی ہے روز بروز مضمحل اور کمزور ہوتے جا رہے ہیں اور اُن کی اس کمزوری کا مظاہرہ روزانہ مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ان کے علاوہ جو چند گھر مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں اُن کا بھی اکثر و بیشتر یہ حال ہوتا ہے کہ بیٹے کو اسکول میں داخل کر دینے کے بعد باپ خود بیٹے کی اخلاقی نگرانی اور اس کی تعمیرِ سیرت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا اور اس کو کلیتہً اسکول کے ماحول اور اس کی فضا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس بنا پر گھر کے ماحول کا اگر اس کے اخلاق پر کوئی بُرا اثر بھی نہیں ہوتا تو اچھا بھی نہیں ہوتا۔ ورنہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا بُرا ہی ہوتا ہے۔

اب رہا اسکول کا ماحول! ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل ملک میں اقتصادی زبوں حالی عام ہے اور پھر اسکولوں کے اساتذہ تنخواہوں کی کمی کی وجہ سے خاص طور پر اس کا شکار رہتے ہیں اور یہ اقتصادی زبوں حالی اور معاشی تنگی سو بلاؤں کی ایک بلا ہے۔ اس کی وجہ سے اسکول کے اساتذہ کا معیارِ زندگی پست ہوتا ہے۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے انہیں سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو آپ اُن سے بلند اخلاق اور اعلیٰ کیرکٹر جن کا اثر ان کے شاگردوں پر پڑ سکے اس کی توقع کس طرح کر سکتے ہیں۔ انہیں اساتذہ میں ایک کافی تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنے کلاس کے طلبا کی معمولی معاوضہ پر ٹیوشن بھی کرتے ہیں اور اب طبعی طور پر شاگرد استاد کو اپنے باپ کا یا خود اپنا اجیر سمجھتا ہے اور اس بنا پر اُستاد کی وہ عظمت جو شاگرد کے دل میں ہونی چاہیئے اور جس کے باعث اس کو اخلاقی تعمیر میں اُستاد سے مدد مل سکتی تھی بالکل مفقود ہوتی ہے۔ کچھ یہ صورت حال اور کچھ عام دماغی و ذہنی انتشار اور اپنے فرائض کا عدم احساس ان سب کا ایک

نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اساتذہ کو اسکولوں کی چہار دیواری میں بُرے بھلے کسی طرح کلاس روم میں پہونچکر اپنا گھنٹہ پورا کرلینے سے واسطہ ہوتا ہے اور بس! اس کے علاوہ طلبار کی اخلاقی نگرانی اور اُن کی تعمیرِ سیرت سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ کلاس روم سے باہر طلبار ان کے سامنے شور وغل مچا رہے ہیں، بیہودگیاں کر رہے ہیں۔ اناپ شناپ اور بے ڈھنگے طریقہ سے کھا رہے ہیں، اساتذہ کو اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ انھیں سمجھائیں اور انہیں نصیحت کریں۔ اس طرح کی سب چیزوں کے متعلق اُن کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اُن کا کام صرف پڑھانا ہے۔ رہا ڈسپلن وغیرہ تو یہ ہیڈ ماسٹر کا فرض ہے وہ جانے اور اُس کا کام۔ غرض یہ ہے کہ اساتذہ میں کام کرنے کی جو مشنری اسپرٹ، خلوص و ہمدردی، اور طلبار کے ساتھ پدرانہ و مربّیانہ برتاؤ ہونا چاہیئے وہ اُن میں نہیں ہوتا، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکول کی زندگی میں طالب علم کی اخلاقی تربیت کا سر و سامان نہ اس کے گھر میں ہوتا ہے اور نہ اسکول میں، اب وہ ہوتا ہے اور اس کا ماحول، اس کی سوسائٹی، شہر کی فضا اور سماج کی عام آب و ہوا۔ اور آج کل ان سب کا جو حال ہے وہ معلوم ہی ہے۔ گوشہ گوشہ میں سینما اور پکچر ہاؤس۔ گھر گھر ایکٹرسوں کے فوٹو۔ ادھر فلمی گانے اُدھر رقص و سرود، بے محابا جلوے۔ فحش لٹریچر۔ مخربِ اخلاق افسانے اور ناول۔ بھیانک گناہوں کے اڈے۔ کہیں کسی جگہ نہ مذہب کا ذکر نہ بُرائیوں پر روک ٹوک۔ نہ بدی پر ملامت۔ نہ اخلاقی فضائل کا چرچا۔ اب خود سوچیئے کہ ایک طالب علم اپنے تحت الشعور کی پختگی کے دور میں جب اس ماحول سے دوچار ہوگا اور جب "طوطی کو ششش جہت سے مقابل ہے آئینہ" کا عالم ہوگا تو اس سے کیونکر اخلاقِ فاضلہ کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ہماری پُرانی نسل جو آج چراغِ سحری ہے اُس کے بزرگوں کو۔ ہندو ہوں یا مسلمان۔ دیکھیئے ان لوگوں نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس زمانہ میں کی جبکہ انگریزی پڑھ کر انگریز بن جانا قابلِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھی گئے اور تین چار سال وہاں رہے لیکن اس کے باوجود مجموعی حیثیت سے ان لوگوں میں جو شرافت، تہذیب، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، تواضع و مروت، ہمدردی و خلوص اور ایک اخلاقی بلندی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ان بزرگوں کا بچپن جس ماحول میں بسر ہوا وہ آج کل کے ماحول سے یکسر مختلف تھا ان بزرگوں نے ابتدائی تعلیم مکتبوں یا پاٹ شالاؤں میں پائی جہاں ان کو اپنے اپنے مذہب کی مقدس کتابوں کی تعلیم ملتی تھی۔ اخلاقی درس ملتا تھا۔ مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں کے کارنامے اُن کے کان میں پڑتے تھے اور اس طرح اُن کے تحت الشعور

ذہن میں اخلاقی اقدار اس طرح رچ اور بسجاتے تھے کہ آئندہ زندگی میں وہ مغربی تہذیب کے ماحول میں رہ کر بھی اپنے قومی اخلاق و خصائل سے بے بہرہ و بیگانہ نہیں ہوتے تھے۔ ان بزرگوں کے ماحول میں باپ کے سامنے یا خاندان کے کسی بزرگ کے سامنے بیٹے کی مجال نہ تھی کہ عشق و محبت کا نام بھی لے۔ کسی نوجوان لڑکی اور اس کے حسن کی فسوں کاریوں کا تذکرہ بھی کرے، صرف یہ ہی نہیں بلکہ شادی ہو جانے کے بعد بھی ایک دو سال تک نوجوان بیٹے کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ ماں باپ کی موجودگی میں بیوی سے بات بھی کر لے۔ لیکن آج زمانہ نے ہمارے اخلاقیات کی کتاب کا جو ایک نیا ورق الٹا ہے تو اب عالم یہ ہے کہ باپ اور ماں، بیٹا اور بیٹی دونوں ایک ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھکر سنیما دیکھتے ہیں اور عشق و محبت کی تمام واردات اور حسن و شباب کی سب رموز و کیفیات ان کی نظر سے گذرتی ہیں اور پھر گھر واپس آکر ان پر تنقید و تبصرہ کا حق ادا کیا جاتا ہے جس میں بزرگ اور خورد سب برابر کا حصہ لیتے ہیں۔ بیٹی ایکٹر کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی ہے تو بیٹا ایکٹریس کے کمال فن کی داد دیتا ہے اور پھر دو چار فلمی گانوں کی نقالی پر یہ گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مغربی ملکوں میں جو آزادی ہے کہیں نہیں! لیکن یورپ اور امریکہ تک کا یہ حال ہے کہ وہاں ایک خاص عمر تک لڑکے یا لڑکی کو سنیما دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں مذہب کی تعلیم کا انتظام اگرچہ حکومت کی طرف سے نہیں ہوتا لیکن مشنری سوسائٹیاں کروروں روپیہ خرچ کر کے خود ہر لڑکے اور لڑکی کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کرتی ہیں۔ اس بنا پر اخلاقی اعتبار سے وہ جس چیز کو برا سمجھتے ہیں اس کو برا جانتے ہیں اور اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا یہ ضابطۂ اخلاق ہمارے ضابطۂ اخلاق سے خواہ کتنا ہی مختلف ہو لیکن بہرحال وہاں ایک کیرکٹر ہے، ایک تنظم ہے۔ اخلاقی یک جہتی ہے۔ اور یہاں پراگندگی۔ انتشار۔ اور اخلاقی انارکی ہے اور اس کے لئے ہمارے بچے نہیں بلکہ ہم خود ذمہ دار ہیں، قصور ان کا نہیں بلکہ ہمارا ہے۔ اسکول کل کا ایک جز ہیں جب کل صالح نہیں تو جز کے صالح ہونے کی توقع عبث ہے۔ جڑ اگر فاسد ہے تو شاخیں کس طرح برگ و بار پیدا کر سکتی ہیں۔ معاشرہ اور سماج کی بنیاد میں اگر فتور پیدا ہو گیا ہے تو اس پر جو عمارت اٹھے گی اس میں بھی استواری نہیں ہو سکتی۔

بہرحال یہ ہے وہ ماحول، یہ ہے وہ سماج اور معاشرہ جس میں پل بڑھ کر اور نشو و نما پا کر ہمارے نونہالانِ قوم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آتے ہیں، یہاں پہونچ کر ان کو جو ماحول ملتا ہے وہ بھی کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ ان سے بلند اخلاق اور اعلیٰ کیرکٹر کی توقع نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف مخلوط تعلیم، مخلوط جلسے، مخلوط ڈرامے اور ناٹک اور مخلوط

کھیل، اور دوسری جانب کالجوں اور یونیورسٹیوں کی اندرونی پالیٹکس اور پارٹی بازی، ان دونوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم اُس سکونِ قلب و دماغ اور ذہنی یکسوئی سے محروم ہوجاتا ہے جو یونیورسٹی ایجوکیشن کے زمانہ میں اُس کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ آج کل عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ طلبا میں کمیونسٹ رجحانات بڑھ رہے ہیں اور اسی بنا پر آئے دن یونیورسٹیوں میں ہنگامے ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ کیونکہ کمیونزم ایک فلسفہ ہے، ایک خاص قسم کا نظامِ فکر ہے، ایک مخصوص انداز کا طرزِ زندگی ہے اس کو اگر کوئی شخص سچ مچ اختیار کرے گا تو وہ اسی وقت کر سکتا ہے جبکہ اس نے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ دنیا کے اقتصادی معاملات و مسائل اور ان کے حل کی شکلوں پر غور کیا ہو۔ اور ہمارے ان نوجوانوں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرنے کے عادی نہیں ہوتے، اس بنا پر اصل یہ ہے کہ طلبا اولاً کمیونسٹ نہیں ہوتے بلکہ ایک ہیجان انگیز ماحول میں رہنے کے باعث ان میں ہمارے قومی اخلاق سے انحراف کرنے کی جو رغبت پیدا ہوتی ہے وہ اس کی تسکین کے لئے کسی سہارے کے جویا اور طلبگار ہوتے ہیں اور نام نہاد کمیونزم کے دامن میں اُن کو وہ سہارا مل جاتا ہے۔ گویا طلبا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کے سامنے اپنے ہر عمل کی صفائی کہاں پیش کرتے پھریں، بس سب سوالوں کا اور ہر احتساب و بازپرس کا ایک جواب یہ ہے کہ ہم کمیونسٹ ہیں۔ یہ ایک نہایت عجیب قسم کا نفسیاتی دھوکہ ہے جس میں طالب علم اور اُس کے نگراں دونوں مبتلا ہوتے ہیں۔

سر رادھا کرشنن یونیورسٹی کمیشن رپورٹ جو تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، تعلیمی مباحث پر ایک نہایت مفصل اور جامع رپورٹ ہے۔ اس کمیشن نے ایک سوالنامہ بھی ہندوستان کے ماہرینِ تعلیم کے نام جاری کیا تھا جس میں چودہ نمبر کا سوال ڈسپلن کے ہی متعلق تھا۔ کمیشن کو اس سوالنامہ کے جو جوابات موصول ہوئے وہ جلد دوم و سوم میں شائع کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں تک مذکورہ بالا سوال کا تعلق ہے اس کے جوابات چند در چند قسم کے ہیں کسی کے نزدیک طلبا کی جسمانی صحت کی کمزوری جس کی عام وجہ مناسب غذا کا نہ ملنا اور ہوسٹلوں کی بدانتظامی ہے، ڈسپلن کے عام فقدان کا سبب ہے کسی کے خیال میں اس کی ذمہ داری ان سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جو طلبا کو اپنے اغراض کا آلۂ کار بناتی ہیں۔ کسی کی رائے ہے کہ طلبا کے لئے کھیل کود، ورزش اور ادبی اور سوشل سوسائٹیوں کی کمی اس بیماری کا سب سے بڑا اور اصلی سبب ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، یہ جو کچھ کہا گیا

بالکل صحیح اور بجا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ یہ جتنے اسباب بیان کئے گئے سب جزئی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں اور کالجوں میں کس چیز کا انتظام نہیں ہوتا۔ طلبا کے لئے کامن روم بھی ہوتا ہے۔ ان کی سوسائٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ اسپورٹس کے سامان کی کمی نہیں ہوتی۔ ان کا جمنازیم بھی ہوتا ہے۔ ایتھلیٹک کلب بھی ہوتا ہے لیکن مشکل تو یہ ہے کہ طلبا ان سے خاطر خواہ فائدہ ہی نہیں اُٹھاتے؟ یہ آخر کیوں؟ بنیادی وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی، یعنی طلبا کا ماحول اور اس کے مضر اثرات جو اُن کے جسم اور دماغ دونوں کی صحت کو برباد کر دیتے ہیں۔

ہمارا یہ دور اس حیثیت سے بڑا عجیب دور ہے کہ اس میں ہر چیز سیاست بن گئی ہے۔ حد یہ ہے کہ علم و تعلیم کے حرم کدے جو اس آلائش سے پاک ہونے چاہیئے تھے اب وہاں بھی پالیٹکس چلتی ہے، وائس چانسلر کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اساتذہ کی ایک جماعت کو اپنے اعتماد میں رکھے۔ یہیں سے پارٹی بندی شروع ہو جاتی ہے۔ کچھ اِدھر اور کچھ اُدھر۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں میں مختلف عہدے، یا امتیازات یا مختلف کونسلوں اور مجلسوں کی ممبری حاصل کرنے کے لئے اساتذہ میں باہمی رقابتیں اور چشمکیں ہوتی ہیں اور اس سلسلہ میں ہر فریق وہ تمام حربے استعمال کرتا ہے۔ اساتذہ جب اس طرح دو دو اور تین تین ٹولیوں اور گروہوں میں بٹ جاتے ہیں تو اس کا لازمی اثر طلبا پر بھی پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ خواہ کچھ اور ہو یا نہ ہو بہر حال یہ ضرور ہوتا ہے کہ طلبا کو اساتذہ کے کیرکٹر اور ان کی بلند سیرت سے جو فائدہ ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہوتا۔

طلبا میں اخلاقی انحطاط کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کا عام رجحان سائنس کی طرف ہو گیا ہے۔ فلسفہ و تاریخ۔ اخلاقیات اور ادب و شعر کے مطالعہ سے انسان میں ایک خاص قسم کا کلچر اور ایک اخلاقی حس پیدا ہوتی ہے۔ اشعار خواہ کسی زبان کے ہوں اُن میں عام طور پر عشق و محبت اور نیاز مندی و خود سپردگی کے مضامین ہوتے ہیں۔ اس بنا پر شعر پڑھنے۔ گنگناتے رہنے اور اس میں حظ آنے سے طبیعت میں سوز و گداز۔ لطافت و نرمی اور نیاز مندی کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں جو اخلاق فاضلہ کے لئے سنگ بنیاد کا حکم رکھتی ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ چونکہ ماں باپ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ لڑکے کو سائنس کے شعبہ میں بھیجا جائے گا اس لئے ہائی اسکول کے مضامین میں بھی کسی کلاسکل زبان کے بجائے اس کو سائنس اور اس کے متعلقہ مضامین ہی لینے پڑتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے قومی سرمایۂ ادبیات۔ زبان کلچر اور اپنے تہذیبی نقوش و خطوط سے ناواقف رہتا ہے اور سائنس میں ڈوبے رہنے سے اس کی زندگی بھی مکینکل

ہو جاتی ہے۔ سائنس کی اہمیت اور ضرورت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن کلچر تو بہرحال فنون کے مطالعہ کے بغیر نہیں آتا اگر توجہ کی جائے تو نظام تعلیم اس طرح بنایا جا سکتا ہے کہ ایک خاص مرحلہ تک ہر طالب علم کے لئے قومی سرمایۂ ادب سے واقفیت کو ضروری قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر ہمارے ملک کے مشہور اور نہایت قابل سائنسداں ہیں مگر ساتھ ہی شعر فہمی اور سخن سنجی کے ذریعہ انھوں نے اپنے خاندان کی روایات شعر و ادب کو جس طرح قائم رکھا ہے کہ بزم شعر و سخن میں بھی بیٹھتے ہیں تو رونق محفل ہو کر بیٹھتے اور شمع انجمن بنے رہتے ہیں۔ ادب اور سائنس ان دونوں چیزوں کے امتزاج نے موصوف کی شخصیت میں جو جاذبیت اور گیرائی پیدا کر دی ہے وہ کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہوگی۔ ہمارے نونہالان قوم کی تعلیم و تربیت بھی شروع سے اگر اسی نہج پر ہو تو پھر سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اُن میں قومی کلچر اور قومی تہذیب و اخلاق کی کمی بھی نہیں آئے گی اور وہ بہ جہت ایک کامیاب و خوشگوار زندگی بسر کرنے کے قابل ہوں گے۔

ڈسپلن

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ڈسپلن رہتا نہیں ہے بلکہ رکھا جاتا ہے یعنی اس کا تعلق طلبا سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ کالج کے پرنسپل اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ان کی لیاقت و قابلیت انتظام سے ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ڈسپلن کے معنی رعب قائم رکھنا ہے اور اس لئے کالج اور یونیورسٹی کے افسر اعلیٰ کو چاہیئے کہ وہ اپنے ماتحتوں یا طلبا کے ساتھ زیادہ خلا ملا نہ رکھے، ان کے ساتھ بے تکلف ہنسے بولے نہیں اور اپنے آپ کو لئے دیئے رکھے ممکن ہے انگریزوں کے زمانہ میں یہ درست ہو کیونکہ خود انگریزوں کی حکومت کی شان یہی تھی اس بنا پر ہر محکمہ کا افسر اعلیٰ اسی طریقہ پر چل کر اڈمنسٹریشن میں کامیاب رہتا تھا۔ لیکن آج جب کہ عوام کی حکومت کا زمانہ ہے اور دنیا میں غیر طبقاتی زندگی کے رجحانات بڑھ رہے ہیں یہ طریقہ نہ صرف یہ کہ مفید نہیں بلکہ سخت مضر ہے۔ چنانچہ آج کل طلبا کی شورش پسندیوں کی جو عام خبریں آ رہی ہیں اگر اُن کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو بے شبہ اس میں بڑا دخل مذکورہ بالا طریقہ کا ملے گا۔ آج اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ وہ اپنے عہدہ، اپنی پوزیشن یا اپنے منصبی اقتدار سے مرعوب کر کے اپنے سے متعلق لوگوں کو قابو میں رکھے اور اُن پر حاوی رہے تو اس کے لئے یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اقتدار کی قوت آزمائی کا جب کبھی سوال آئے گا تو چونکہ طلبا کو معلوم ہے کہ آج عوامی اور اجتماعی مطالبہ سب سے بڑی طاقت ہے اس بنا پر ایک بالا دست طاقت کو شکست دینے کے لئے وہ سب ایک محاذ پر جمع ہو جائیں گے اور آخر حریف کو سرنگوں کر کے دم لیں گے۔

ہماری مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں جابجا جو مشن کالج قائم ہیں اُن پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم

ہوگا کہ مجموعی اعتبار سے جتنا اچھا ڈسپلن ان کالجوں میں ہوتا ہے دوسرے کالجوں میں نہیں ہوتا حالانکہ ان کالجوں کے پرنسپل اور مشنری اساتذہ طلبا کے ساتھ بے تکلف ہو کر رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے اور کھیلتے کودتے ہیں۔ طلبا کی انجمنوں میں شریک ہوتے اور ان کی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں۔

بہرحال حق یہ ہے کہ ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے سب سے مقدم اور ضروری چیز یہ ہے کہ ادارہ کے افسر اعلیٰ کو طلبا کا اور اس کے رفقار کا اعتماد حاصل ہو۔ اور اس اعتماد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں مندرجہ ذیل صفات پائی جائیں۔

(۱) پہلی صفت فرائض مفوضہ کو باحسن وجوہ انجام دینے کی صلاحیت ہے، اسے اپنے کام اور اس سے متعلقہ تمام امور پر پورا حاوی ہونا چاہیئے اس میں تحریر اور تقریر کا ملکہ ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے مافی الضمیر کو دلنشین طریقہ پر اپنے مخاطب کے ذہن میں بٹھا سکے۔ لیاقت وقابلیت بجائے خود ایک کمال ہے۔ ایک حسن ہے اور ہر کمال اور حسن اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔

(۲) دوسری صفت خلوص اور محبت ہے۔ کوئی فیصلہ کرتے وقت اپنے اقتدار کی عصبیت سے بالکل آزاد ہو کر اسے مخلصانہ طور پر یہ سوچنا چاہیئے کہ علمی اور تعلیمی اعتبار سے طلبا کا فائدہ کس میں ہے بس اس کے علاوہ کوئی اور چیز مثلاً یہ کہ میری بات کس طرح اونچی رہے گی، اس سے میرا اقتدار تو کم نہیں ہو جائیگا۔ اس قسم کا کوئی سوال اس کے ذہن میں نہیں ہونا چاہیئے

(۳) خود اس کا کیرکٹر بلند، بے داغ اور بے عیب ہونا چاہیئے۔ کیرکٹر کی بلندی سے انسان کی حقیقی عظمت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور جو کام طاقت وقوت کے بڑے بڑے مظاہروں سے نہیں ہو سکتا وہ کیرکٹر کی بلندی اور اخلاق کی عظمت سے بآسانی ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں جو ہنگامے ہوتے ہیں تو عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ آخر کار انہیں اساتذہ کی دخل اندازی سے فرو ہوتے ہیں جو طلبا کے حلقہ میں اپنی لیاقت وقابلیت۔ خلوص ومحبت اور اعلیٰ اخلاق وصفات کے باعث ہردلعزیز ونیکنام ہوتے ہیں۔

(۴) چوتھی صفت عزم واستقلال ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مرتبہ ایمانداری اور خلوص ومحبت کے ساتھ طلبا کے فائدہ کے پیش نظر جب کوئی فیصلہ کر لیا جائے تو پھر خواہ کچھ ہو جائے اس پر قائم رہنا چاہیئے۔ کسی دباؤ سے اپنے فیصلہ کو بدلنا، درانحالیکہ اس کی معقولیت کا پورا یقین ہو۔ کسی ادارہ میں بدنظمی اور انتشار کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔

یونیورسٹی کے حاکم اعلیٰ کا برتاؤ طلبا کے ساتھ بالکل ایک بااصول باپ کا سا ہونا چاہیئے۔ بااصول باپ سے اس کی اولاد ڈرتی بھی ہے اور محبت بھی کرتی ہے۔ ڈرتی اس لئے ہے کہ وہ بااصول ہے کسی غلط بات سے چشم پوشی اور حق کے معاملہ میں مداہنت اس سے صادر نہیں ہوسکتی اور محبت اس لئے کرتی ہے کہ وہ اُن کا باپ ہے حقیقی معنیٰ میں اُن کا خیرخواہ۔ مُربّی اور اُن کے بُرے بھلے کا دھیان رکھنے والا ہے۔ کسی بیٹے کو باپ کے خلاف بغاوت کی جرأت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک باپ میں یا تو اصول پرستی کا فقدان نہ ہو یا اس میں پدرانہ شفقت کی کمی نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اولاد خواہ کتنے ہی شدید مظاہرے کرے لیکن باپ بہرحال کبھی اس پر آمادہ نہیں ہوسکتا کہ وہ زہر کی پھنکی کو شکر سمجھ کر کھا جانے کی اجازت دیدے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مفسد اور شریر عناصر ہر ادارہ میں تھوڑے ہی ہوتے ہیں اس بنا پر اگر مذکورہ بالا صفات کا حامل ہونے کی وجہ سے ادارہ کے ذمہ دار اعلیٰ نے اکثریت کا اعتماد حاصل کرلیا ہے تو گنتی کے چند مفسد عناصر کو کسی سرکشی کی جرأت نہ ہوگی اور ادارہ کا ڈسپلن خراب نہ ہوگا۔

اس موقع پر اگر میں اپنا ایک ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بیان کروں تو شاید بے محل نہ ہوگا۔

فروری سنہ ۴۹ء میں جب میں نے پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے عہدہ کا چارج لیا تو معلوم ہوا کہ اس مدرسہ میں اُردو اور بنگلہ کا جھگڑا مدرسہ کی ایک پُرانی روایت ہے۔ چنانچہ جب میں پہونچا تو اس زمانہ میں بھی ہائی اسکول کے طلبا ر میں جن کی مجموعی تعداد سات سو کے قریب تھی یہ نوک جھونک چل رہی تھی۔ میں پہونچا تو بنگالی طلبا ر نے طبعی طور پر مجھکو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھا۔ مجھکو یہ بات محسوس ہوئی تو مجھے اس پر غصہ ذرا نہیں آیا بلکہ میں نے انھیں معذور سمجھا۔ اسی اثنا میں اُردو سکشن کے طلبا نے مجھکو اڈریس پیش کرنا چاہا مگر میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ آخر جو مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا وہ ایک دن پھوٹ پڑا۔ مجھکو یہاں آئے ہوئے تقریباً ڈھائی ماہ ہی ہونے تھے کہ ۲۴ راپریل کو میں شعبۂ عربی میں اپنی ایک کلاس لے رہا تھا کہ اچانک ہائی اسکول میں بڑا شور وغل ہوا۔ میں نے فوراً کلاس روم سے باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ طلبا بے تحاشا بھاگے جارہے ہیں۔ میں اوپر کی منزل سے اُتر کر ان طلبا کی طرف جانا چاہتا تھا کہ اُردو سکشن کے بعض طلبا نے مجھکو گھیر لیا اور کہا کہ آپ ہرگز ادھر نہ جائیے۔ وہ آپ کے لئے خطرہ ہے مگر میں نے اُن کی ایک نہ سُنی اور انھیں جھٹکا دیکر موقع واردات پر پہونچا۔ یہاں بنگالی اور غیر بنگالی طلبا ر میں باقاعدہ لاٹھی چل رہی تھی۔ اکثر اساتذہ نے اپنے اپنے کلاس روم میں بند ہوکر اندر سے کواڑ بند کرلئے تھے اور صرف ایک ہڈ ماسٹر تھے

جو افہام و تفہیم کی کوشش کر رہے تھے مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن کارگر نہ ہوئی اتفاق سے اسوقت مدرسہ کے قریب ہی دو سپاہی لاٹھیاں لئے کھڑے تھے۔ میں نے اُن کو اندر بلا لیا اور طلبا سے کہا کہ اگر تم لوگ لڑائی بند نہیں کرو گے تو میں لاٹھی چارج کرا دوں گا۔ یہ سُنکر مجمع فوراً منتشر ہو گیا اور طلبا ادھر اُدھر ہو گئے۔ کلکتہ مدرسہ چونکہ سرکاری اور ایک مشہور تاریخی ادارہ ہے اس لئے شہر میں فوراً اس واقعہ کی شہرت ہو گئی اور پندرہ منٹ کے اندر اندر پولیس کے افسران اعلیٰ موٹر سائیکلوں پر مدرسہ پہونچے اور میرے آفس میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے اس اثنا میں یہ انتظام کیا تھا کہ جو طلبا زخمی ہو گئے تھے اُنکو ڈاکٹر کے پاس بھیجا مدرسہ میں چھٹی کا گھنٹہ بجوا دیا۔ اور مدرسہ کے اطراف میں مختلف راستوں پر آدمی متعین کر دیئے تاکہ وہ اس کی نگرانی رکھیں کہ گھر جانے والے طلبا میں سے کوئی کسی پر حملہ نہ کرے اور وہاں آپس میں مار پیٹ نہ ہو۔

اب پولیس کے افسران اعلیٰ نے میرا بیان قلم بند کرنا شروع کیا تو انھوں نے دونوں فریق کے سرغنہ لڑکوں کے نام دریافت کئے اس وقت ہڈ ماسٹر میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے وہ یہاں کے پرانے آدمی ہونے کے باوجود بہت گرم مزاج اور عاقبت نا اندیش تھے اس لئے انھوں نے چند لڑکوں کے جو اُن کے نزدیک بہت شریر اور مفسد تھے نام لئے اور مجھ سے کہا کہ آپ ان لڑکوں کے نام لکھا دیجئے اور نہ صرف یہ بلکہ پولیس کو ساتھ لیجا کر ان کے گھروں کی تلاشی کرائیے۔ وہاں لاٹھیاں اور سوڈا واٹر کی بوتلیں ملیں گی۔ لیکن میں نے بڑی سختی سے ہڈ ماسٹر سے کہا کہ آپ خاموش رہیئے۔ یہ آپ کا معاملہ نہیں ہے۔ اور ادھر میں نے پولیس کے افسروں کے سامنے کسی لڑکے کا نام لینے سے انکار کر دیا اور اُن سے کہا کہ آپ کے بروقت پہونچ جانے کا جس سے مجھکو بڑا سہارا ملا بہت بہت شکریہ! لیکن اب اس معاملہ کو آپ صرف میرے لئے ہی چھوڑ دیجئے میں خود سب ٹھیک کر لوں گا آپکو دخل دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ چنانچہ چار کی ایک ایک پیالی اور سگرٹ و پان کی تواضع کے بعد یہ مجلس ختم ہو گئی اور میں ان کو رخصت کر کے اپنی قیامگاہ پر چلا آیا۔ یہ سنیچر کا دن تھا۔ اگلے دن اتوار تھا اور مدرسہ کی چھٹی تھی مجھکو گھر پر اطلاعات ملتی رہیں کہ اس واقعہ کی وجہ سے طلبا میں بڑا سخت ہیجان ہے۔ ہر فریق یہ سمجھتا ہے کہ اُس دن وہ بے خبری میں پٹ گیا۔ اس لئے پیر کے دن مدرسہ کھلتے ہی وہ فریق ثانی سے بدلہ لیگا۔ یہاں تک کہ اتوار اور پیر کی درمیانی شب میں گیارہ بجے کے قریب پولیس کا ایک افسر میرے مکان پر آیا اور مجھکو سوتے سے جگا کر کہا کہ کل کے واقعہ کی وجہ سے نہ صرف مدرسہ کے طلبا میں سخت کشمکش اور ہیجان ہے بلکہ ہم کو اطلاعات پہونچی ہیں کہ دوسرے کالجوں کے طلبا میں بھی اس کی وجہ سے ہیجان ہے۔ اور اُردو بنگلہ بولنے والے طلبا کے ہر جگہ الگ الگ جلسے ہوتے رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ کل صبح کو مدرسہ

کھُلے گا تو بڑے پیمانہ پر فساد ہو جائیگا اور خطرہ اس کا بھی ہے کہ یہ فساد کہیں فرقہ وارانہ شکل اختیار نہ کر لے اس بنا پر میری رائے ہی کہ آپ مدرسہ چار دن کے لئے بند کر دیجئے۔ میں گھر پر یکہ و تنہا تھا کسی سے مشورہ نہیں لے سکتا تھا۔ تاہم خدا پر بھروسہ کر کے میں نے پولیس افسر سے فوراً کہا کہ مدرسہ کل ضرور کھُلے گا۔ ایک دن کے لئے بھی بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد اُس نے کہا کہ اچھا اگر آپ یہ نہیں مانتے تو کم از کم ہم کو اجازت دیجئے کہ جب مدرسہ کھُلے تو ہم پولیس کے آدمی مدرسہ کے دروازوں پر متعین کر دیں تاکہ گڑبڑ ہو تو اُس پر قابو حاصل کیا جا سکے لیکن میں نے اس کی بھی اجازت نہیں دی البتہ میں نے یہ کہا کہ آپ پولیس کی ایک گاڑی مدرسہ سے ذرا فاصلہ پر بازار کی جانب لا کر کھڑی کر دیں تاکہ اگر خدانخواستہ صورتِ حال میرے قابو سے باہر ہو تو میں آپکی امداد طلب کر سکوں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔

دوسرے دن مدرسہ کھلتے ہی میں نے اپنی تقریر کا اعلان کرا دیا۔ کچھ طلبا تقریر سننے کے لئے آ رہے تھے، ٹولیاں بنائے ہوئے اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ میں اُن کے پاس گیا اور اُن سے کہا کہ جو کچھ تمہیں کرنا ہے وہ بعد میں بھی کر سکتے ہو مگر پہلے جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ سُن لو۔ یہ سُنکر طلبا اور اساتذہ جمع ہو گئے اور میں نے تقریباً پون گھنٹہ تقریر کی جس میں میں نے انکو بتایا کہ ملک کی آزادی کن مشکلات اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے اس کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اس کو قائم رکھنے اور ملک کو ترقی دینے کے لئے طلبا کے کیا فرائض ہیں اور ان میں مذہب اور زبان کے اختلافات کے باوجود کس قدر باہمی اتحاد و یکجہتی ہونی چاہیئے اور اس کے بعد میں نے کہا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں جو باتیں میں نے کہی ہیں اگر تم اُن کو سچ مانتے ہو تو میں تم سے ایک بات کہتا ہوں اُسے بھی مان لو۔ تقریر کے لب و لہجہ میں چونکہ بجائے غصّہ کے ہمدردی، جھنجلاہٹ کے بجائے سوز و گداز تھا اس لئے "از دل خیزد و بر دل ریزد" کے مطابق اس کا خاطر خواہ اثر ہوا لیکن ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا کہ "جب تک ہمارے مطالبات منظور اور ہماری شکایتیں دور نہیں ہونگی ہم کوئی بات سُننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ یہ سُنکر میں نے فوراً لب و لہجہ بدل کر اور غصّہ کے ساتھ کہا کہ اچھا اگر تم چھوٹے بھائی کی حیثیت سے میرا مشورہ قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو تو اب یہ معاملہ ختم سمجھو اور پھر جو کچھ ہو گا وہ رسمی طور پر ہو گا۔ میری زبان سے یہ سنتے ہی تمام طلبا نے بآواز بلند کہا کہ آپ ہم سے جو کہیں گے ہم وہی کریں گے۔ اور اس ایک طالب علم کو سب بُرا بھلا کہنے لگے۔ اب میں نے کہا کہ اُردو سکشن کا ہر طالب علم بنگلہ سکشن کے ہر طالب علم سے گلے ملے اور معانقہ کرے۔ یہ سُننا تھا کہ یک بیک "پرنسپل زندہ باد"

"کلکتہ مدرسہ زندہ باد" کے پُرشور نعرے بلند ہوئے اور جو طلبا دو دن پہلے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئے تھے وہ اب اسی وقت ایک دوسرے کو گود میں اٹھائے پھر رہے تھے۔ فوراً یہ خبر اطراف واکناف میں پھیل گئی اور میرے پاس مبارکباد کے پیغام آنے لگے۔ شام کو بنگالی طلبا، ایک ہجوم کی شکل میں میرے نام کا نعرہ لگاتے ہوئے میرے مکان پر پھول اور ہار لیکر آئے اور مجھ سے معافی مانگی کہ ہم آپکی نسبت بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ ہم کو اس پر سخت ندامت اور پشیمانی ہے۔ اب ہم کو یقین ہے کہ آپ بیشک ہم سے اولاد کی طرح محبت کرتے ہیں۔ دوسرے دن کلکتہ کے انگریزی بنگلہ اور اُردو کے اخبارات میں اس خبر کو جلی عنوان سے شائع کیا گیا۔ انگریزی کے مشہور اخبار امرت بازار پتریکا نے "نئے پرنسپل کا پہلا کارنامہ" کے عنوان سے ایک ادارتی نوٹ بھی لکھا تھا۔ اس کے علاوہ بنگلہ اور اُردو کے اخبارات نے بھی نوٹ لکھے۔ کل کیا ہوگا اس کا علم تو خدا ہی کو ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ پھر کبھی اُردو بنگلہ کا جھگڑا نہیں ہوا سب طلبا اتفاق واتحاد سے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ چونکہ اس واقعہ کا تعلق خاص میری ذات سے ہے اس لئے میں اس کو بیان کرنا ہرگز گوارا نہ کرتا اگر یہ یہاں کے تمام اخبارات میں شائع نہ ہوا ہوتا اور کلکتہ کے ہر شخص کو جو کسی نہ کسی تعلیمی ادارہ سے تعلق رکھتا ہو معلوم نہ ہوتا۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے پہلے جن طریقوں کو مفید یا ضروری خیال کیا جاتا تھا اب حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اُن طریقوں کی افادیت بھی جاتی رہی ہے اور اب اگر ڈسپلن قائم رہ سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ ارباب اختیار واقتدار خود اپنے آپ میں ڈسپلن پیدا کریں۔ یونیورسٹی کے ذمہ دار عہدہ داروں کو اپنی شخصیت بنانے یا اُن کے ذریعہ کسی مادی منفعت حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ خلوص قلب کے ساتھ نوجوان نسلوں کی خدمت اور اُن کی فلاح وبہبود اصل مقصد ومدعا ہونا چاہیئے۔ طلبا کے ساتھ حاکمانہ برتاؤ نہ کریں بلکہ بیدار مغز اور فرض شناس باپ کا سا معاملہ کریں۔ یونیورسٹی کی فضا کو پالیٹکس اور سیاسیات سے پاک وصاف رکھیں، طلبا میں علمی اور تعلیمی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ دوسروں کے ساتھ کوئی شخص اس وقت تک انصاف نہیں کرسکتا جب تک کہ پہلے وہ خود اپنے ساتھ انصاف نہ کرے طلبا کی طرف سے شک وشبہ میں مبتلا ہونے کے باعث ان کو دبائے رکھنے اور نئے نئے آئین وضوابط ایجاد کرکے

ان کو دبائے رکھنے کی کوشش کرنے کے بجائے ہونا یہ چاہیئے کہ تقریروں، لکچروں اور ان کے ساتھ بے تکلف گفتگو کے ذریعہ ان میں ذہنی بیداری اور شعورِ نفس پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنا اچھا بُرا خود سوچیں اور سمجھیں اور جو چیز اُن کے لئے مضر ہے وہ خود اس سے بچیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کم از کم طلبا کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گی وہ آپ پر پورا اعتماد کرے گی اور اس کی وجہ سے چند فتنہ پرور عناصر کو سر اٹھانے کا موقع نہیں ملیگا اور اگر ایسا ہوا بھی تو ان شریر عناصر کو دبانے کے لئے آپ جو اقدام کریں گے طلبا کی اکثریت اس میں آپ کی معاون ہوگی جس طرح بدی متعدی ہے اسی طرح بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر نیکی اور خلوص بھی متعدی ہے۔ اس لئے اگر آپ نیک اور مخلص ہیں تو لازمی بات ہے کہ آپ کے ساتھی بھی نیک اور مخلص ہونگے۔ ڈاکٹر سر شاہ سلیمان رحمۃ اللہ علیہ چونکہ انتہائی قابل ہونے کے ساتھ حد درجہ نیک مخلص اور دیانت دار بھی تھے اس لئے ہر شخص جانتا ہے کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی وائس چانسلری کی قلیل مدت میں ہی یونیورسٹی کا آب و رنگ جس طرح بدل دیا تھا اور ہر لحاظ سے اس میں جو خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ دوسرے بڑے بڑے وائس چانسلروں سے برسوں میں بھی پورا نہ ہو سکا۔ یہی حال ہندو یونیورسٹی بنارس کا شری مدن موہن مالویہ کے عہدِ سعادت میں ہوا تھا۔

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات

"بین الاقوامی سیاسی معلومات" میں سیاسیات میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحوں، قوموں کے درمیان سیاسی معاہدوں، بین الاقوامی شخصیتوں اور تمام قوموں اور ملکوں کے سیاسی اور جغرافیائی حالات کو نہایت سہل اور دلچسپ انداز میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب اسکولوں، لائبریریوں اور اخباروں کے دفتروں میں رہنے کے لائق ہے۔ جلد اوّل جدید ایڈیشن جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے

قیمت مجلّد آٹھ روپے ([illegible]) علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی